سرسید احمد خان اور اِسلام: ایک مقدمہ

ڈاکٹر رضیہ مجید
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ
اُردو، جی سی، یونیورسٹی لاہور

Abstract

Sir Syed was born in a religious household which is quite visible in his earlier works as they are somewhat orthodox in nature. Prior to 1857, his writing style as well as the content was more primitive; however, after the War of Independence, his writing became more modern. He tried to bring forth a doctrine which brought together elements of both Eastern and Western cultures. In doing so, he ended up addressing some matters pertaining to religion which brought about a wave of severe criticism from many Muslims in the subcontinent.

سرسید احمد خان کی پیدائش ہی سے دینِ اسلام سے ان کے تعلق کے گہرے سراغ ملتے ہیں۔ سرسید کے والد دین دار صوفی منش میر تقی تھے جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے جانشین شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ پھر ان کی دین دار والدہ نے مذہبی اطوار و اقدار کو سرسید کی شخصیت میں سمو دیا تھا۔ سرسید کی شخصیت میں مذہبی اثرات کو پختہ کرنے میں دہلی کے ترویج مذہب اور علومِ اِسلامی کے دو بڑے مراکز کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک مدرسۂ شاہ عبدالعزیز اور دوسرا مرزا جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علی کی خانقاہ، جہاں بالترتیب ولی اللٰہی مسلک اور طریقہ نقش بندیہ مجددیہ کی پیروی ہوتی تھی۔(۱) حالی کے بقول ''اِسلام کی حقیقت کا یقین اور بانیٔ اِسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔۔۔ مذہب ہی کی آغوش میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔''(۲) ولی اللٰہی خاندان سے عقیدت کا اظہار ہمیں سرسید کی آثار الصنادید میں نظر آتا ہے اور اس شعر میں بھی اس کا اظہار ہے:

به مکتب رفتم و آموختم اسرارِ یزدانی
زفیضِ نقش بندِ وقت، جانِ جان جانانی (۳)

سرسید احمد خاں اپنے ہم نام سید احمد کی تحریکِ اصلاح و جہاد سے متاثر تھے اور اس دور میں وہابیت کا اعتراف اور اس کی تبلیغ کرتے رہے جب کہ اہلِ مغرب کی نظر میں وہابی باغی اور معتوب تھے۔ ۱۸۹۵ء کے ایک خط

میں سرسید نے اعتراف کیا ہے:

''میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ایک وہابی۔دوسرے وہابی کریلا۔تیسرے وہابی کریلا اور نیم چڑھا۔میں اپنے تئیں تیسری قسم قرار دیتا ہوں اور بجز حق، حق، حق جو میرے نزدیک ہو۔ذرّہ برابر دریغ نہیں کرتا۔''(۴)

سرسید احمد خان برصغیر میں مسلم فکر کے وہ نمائندہ تھے جو قدامت پرستی کے شدید مخالف اور تجدد کے علم بردار تھے۔ حالاں کہ ۱۸۵۶ء سے پہلے سرسید پر قدامت پرستی چھائی ہوئی تھی۔جامِ جم (۱۸۴۰ء)، آثار الصنادید (۱۸۴۷ء)، قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین (۱۸۴۸ء) اور رسالہ راہِ سنّت در ردِّ بدعت (۱۸۵۰ء) میں سرسید کا پُر تصنع اُسلوب اُن کی قدامت پرستی اور انتہا پسندی کی دلیل ہے۔اپنی تصنیف آئینِ اکبری پر لکھی ہوئی مرزا غالبؔ کی تقریظ کو سرسید نے شائع نہ کیا کیوں کہ غالب نے اس میں انگریزوں کی صنعتی ترقی اور سائنسی ایجادات کی تعریف کی تھی۔(۵) جب کہ دوسری طرف ۱۸۵۷ء سے قبل سرسید کے قلعہ چھوڑ کر انگریزی ملازمت اختیار کرنے سے اُن کی شخصیت میں انگریز نوازی کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔مولانا حالی کے مطابق ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے سرسید کے دل پر وہ کام کیا جو لوتھر کے دل پر بجلی گرنے نے کیا تھا۔۔۔غدر کی آنچ نے سرسید کو اپنے طبقہ کی سطح سے بالاتر کر دیا تھا۔(۶) ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ہولناکیوں کے اس عینی شاہد نے ہندوستانیوں کی نجات اسی میں جانی کہ وہ مغربی تہذیب اور علوم وفنون کو قبول کر لیں۔دور اندیش سرسید کی نظر میں تہذیبِ مغرب سے علیحدگی اور کنارہ کشی ہندوستانی مسلمانوں کو مزید زوال کی گہرائیوں میں دھکیل دے گی۔اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی تصنیف مسلم ممالک میں اِسلامیت اور مغربیت کی کش مکش میں لکھتے ہیں:

''ہر ذی عقل جو اس مغربی تہذیب کی تاثیر و تسخیر اور قوت و وسعت سے واقف ہے اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مشرقی ممالک روحانی اور مادی حیثیت سے کتنے کمزور ہو چکے ہیں اور اس قوتِ ایمانی اور خود اعتمادی میں کتنا انحطاط رونما ہو چکا ہے جس سے اس تہذیب کے ساتھ کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔وہ اس اندیشہ میں حق بجانب ہوگا۔۔۔کہ بے اعتمادی، احساس کمتری اور روحانی کمزوری کے ساتھ کوئی قوم زیادہ دنوں تک اپنی انفرادیت باقی نہیں رکھ سکتی اور کسی ایسی تہذیب کا مقابلہ نہیں کر سکتی جس کے ساتھ زمانہ کا رجحان شامل ہو چکا ہے۔''(۷)

سرسید نے اسی مغربی جدیدیت کو اپنایا اور اسی کا اثر ان کے رفقا پر بھی رہا۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب تفہیم و تجزیہ میں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ تحریک کو ایک نظامِ شمسی مانا جائے تو سرسید احمد خاں اس نظامِ شمسی کے سورج کی حیثیت رکھتے ہیں۔جن سے تمام وابستگانِ تحریک کسبِ فیض کرتے اور مُستنیر ہوتے نظر آتے ہیں۔سرسید کی مغرب زدگی کا اثر کم وبیش ان کے تمام رفقا پر ہے۔''(۸)

ایک ایسے دور میں جب اسلام اور اہل اسلام مستشرقین کی افترا پردازیوں کی زد میں تھے۔ سرسید احمد خان مغربی تعلیم کی وکالت میں اپنی قوم کے روایتی حلقوں سے تصادم مول لینے، یورپی مستشرقین سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مناظرہ بازی کرنے اور انگریز حکمرانوں سے مسلمانوں کے لیے سیاسی رعاتیں طلب کرنے کی سہ بعادی (Thrice Pronged) حکمت عملی اختیار کیے ہوئے تھے۔(۹) مسلمانوں کے لیے جدیدیت کو اختیار کرنا ہندوستان کی دوسری اقوام کی نسبت زیادہ دشوار تھا۔ ہندوستانی مسلمان ابھی اپنی نخوتوں کے حصار سے نہ نکلے تھے۔ ان میں اتفاق کی کمی تھی۔ پھر اس عہد کی جدیدیت سے وابستہ سماجی اور تہذیبی تبدیلیاں مسلمانوں کو انتہائی ضرر رساں اور خطرناک نظر آئیں اس لیے انھیں کسی نئے افق کی طرف متوجہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ اونچے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک طرف تو جدید تعلیم کو بدعت اور ایجاد قرار دیتے ہوئے اس سے فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھے اور دوسری طرف ماضی میں حکمران طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر تجارت اور کاشت کاری کے گُر تک نہ جانتے تھے۔ اس کے برعکس ہندو اپنی غلامانہ تاریخ اور ذہنیت کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں میں دخیل تھے اور حکمران طبقے کے علوم وفنون کے حصول سے ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔ سرسید کی مستقبل شناسی نے انھیں احساس دلایا کہ اگر انگریز عجلت میں ہندوستان سے چلے گئے تو مسلمان گھاٹے میں رہ جائیں گے، کیوں کہ وہ ہندیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ دوسری طرف سرسید کے خیال میں مسلمان علوم مشرقی کے حصول سے ترقی نہیں کر سکتے، بلکہ ان کی ترقی صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پر منحصر ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید احمد خان نے ۱۸۶۴ء میں غازی پور مراد آباد میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ جسے بعد میں علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ سوسائٹی کا قیام اساسی طور پر مشرق و مغرب کے علوم کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیے عمل میں آیا تا کہ ان کے قلب ونظر میں تبدیلی ہو۔ تاریخ، سیاست، معاشیات، زراعت، ریاضی اور دوسرے مفید علوم پر مشتمل تصانیف کے تراجم شائع کیے گئے۔ سوسائٹی کی تاسیس سے خاص طور پر شمالی ہندوستان میں ایک علمی فضا پیدا ہوئی جس سے انگریز حکمرانوں اور ہندوستانی مسلمانوں میں منافرت کے جذبات کم ہوئے اور مسلمانوں کے لیے افہام وتفہیم کی راہ نکلی۔ یوں ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کی راہ ہموار ہوئی۔ سرسید احمد خاں سائنٹفک سوسائٹی کی افادیت بیان کرتے ہوئے مسافرانِ لندن میں لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے ادنیٰ تک انہی کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھودی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی وتربیت کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔''(۱۰)

۱۸۶۴ء میں سرسید نے غازی پور میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار جاری کیا جو بعد ازاں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے نکلتا رہا۔ اس گزٹ میں سماجی، اخلاقی، سیاسی اور مذہبی

موضوعات پر مضامین چھپتے رہے جو سرسید کے اصلاحی کام کو آگے بڑھاتے رہے۔ ۱۸۷۸ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا اور تعلیمی مساعی تیز تر ہوئیں۔ عام خیال ہے کہ سرسید کے اقوال میں مذہب کا نام بہت ہے مگر عملی صورتِ حال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے اور یہ کہ سرسید کے نزدیک حصولِ تعلیم کا اولیں مقصد روٹی کا حصول تھا لہٰذا مذہبی تعلیم کا حصول ان کے لیے زیادہ اہم نہیں۔ سرسید نے تعلیم یافتہ حضرات کے چھ درجے بنائے اور مذہبی تعلیم کو پانچویں درجے پر رکھا۔(۱۱) اس امر سے اس عام رائے کو تقویت ملی کہ سرسید انگریز سرکار کے لیے بابو پیدا کر رہے تھے۔ اس دور میں جب سائنس نے کاروباری وسعت اور تجارتی قدر و قیمت حاصل نہ کی تھی اور یہ صرف روشن خیالی اور فطرت شناسی کا تجسس پیدا کرنے کا ذریعہ تھی، سرسید کا سائنس پر از حد زور دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ تعلیم برائے سرکاری ملازمت ان کا مطمحِ نظر نہ تھا۔ سرسید کو پوری طرح احساس تھا کہ تعلیم ہی مہذب قوموں کی پیروی کا گر سکھا سکتی ہے۔ سرسید اپنے ایک مضمون ''مہذب قوموں کی پیروی'' میں لکھتے ہیں:

> ''نا مہذب قوم کو تہذیب یافتہ قوم کی پیروی کرنی ضرور پڑتی ہے مگر بعض مرتبہ یہ پیروی ایسی اندھا دھندی سے ہوتی ہے جس سے بجائے اِس کے کہ اِس پیروی سے فائدہ اٹھاویں اُلٹا نقصان حاصل ہوتا ہے اور جس قدر نا مہذب ہوتے ہیں، اِس سے اور بھی ناشائستہ ہو جاتے ہیں(۱۲)

اسی سبب سے جب ۱۸۸۵ء میں ہیوم نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی تو سرسید نے پس ماندہ مسلم قوم کو اس میں شمولیت سے منع کیا۔ البتہ سرسید کی تعلیمی پالیسی پر ہندوستان کے مختلف مسلم مذہبی حلقوں کی طرف سے ردِعمل کا اظہار کیا گیا۔ یہاں تک کہ علی گڑھ کالج کو لادینیت کا مرکز قرار دیا گیا مگر سرسید کے خیالات سے کما حقہ واقفیت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ مولانا اسماعیل پانی پتی سرسید کے تعلیمی خیالات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔سرسید نے جس نہایت اہم امر کی جانب مسلمانوں کی توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو مذہبی تعلیم بھی لازمی طور پر دینی چاہیے ورنہ کبھی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی اور قوم اصل تہذیب و شائستگی سے محروم رہتی ہے۔ کیوں کہ پسندیدہ اخلاق مذہب پر مضبوطی سے قائم ہوئے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔''(۱۳)

سرسید کے خیال میں مذہب اور جدید سائنس کی تطبیق نئی نسل کو دہریت سے بچا سکتی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب علما جدید سائنس سے متعارف ہوں اور یہ امر مغربی اور انگریزی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اپنے مقالے ''مسلمان اور تعلیم انگریزی'' میں سرسید لکھتے ہیں:

> ''علوم دین کی کتابوں کی ہمارے ہاں کچھ کمی نہیں ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے علمائے اِسلام کو بہت سے مذہبی امور کے بیان کرنے میں دیگر علوم سے استعداد لینی پڑتی ہے۔۔۔ وہ دیگر علوم ہماری موجودہ کتابوں میں صرف یونانیوں کی تقلید سے بھرے ہوئے ہیں۔ پورے طور پر زمانۂ

حال کی ترقی کے مطابق موجود نہیں ہیں اور اس لیے ہم کو مذہب کے لیے بھی کسی یورپ کی زبان کے ذریعہ ان علوم کے حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔'' (۱۴)

اگرچہ تعلیم نسواں کے ضمن میں سرسید کے خیالات مذہبی دائرے تک محدود تھے۔ سرسید کو احساس تھا کہ اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیمِ نسواں جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو مضر نتائج برآمد ہوں گے۔ ان کے خیال میں ''عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لیے آفتِ بے درماں ہے۔'' (۱۵) البتہ وہ عورتوں کے لیے پرانے طریقۂ تعلیم کو درست جانتے تھے تاکہ دین و دنیا میں بھلائی ملے اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رہیں۔ (۱۶) ان خیالات کے اسباب کا سراغ بھی سرسید کی تحریروں سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ سرسید اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''ہماری قوم کے لڑکوں کی جو ابتر و خراب حالت ہے اور (جو) بدعادتیں اور بدافعال اُن کے ہیں اور بداخلاق اور بدطریقہ اُن کا اپنی جوروؤں کے ساتھ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس وقت تمام اشراف خاندانوں میں ایک لڑکا بھی نیک چلن اور خوش اخلاق، مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں نکلنے کا جو اپنی جورو کو ایک انیس غم گسار سمجھے۔ کل خاندان کے لڑکوں کا یہ حال ہے۔ جوروؤں کو لونڈیوں سے بدتر سمجھتے ہیں اور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں جو جوروؤں کے ساتھ نہیں برتتے۔۔۔ بے تربیت لڑکی پر یہ مصیبت صرف ایک حصہ ہے۔ اُس کو خود خیالات عمدہ و تہذیب کے نہیں ہیں۔ اس کو اپنے خاوند کی بداخلاقی صرف بقدر ایک حصہ کے رنج و مصیبت میں رکھتی ہے اور جب کہ وہ اپنے تمام ہم سروں کا یہ ہی حال دیکھتی ہے تو کسی قدر تسلی پاتی ہے۔۔۔ مگر جب وہ خود شائستہ و مہذب و تربیت یافتہ اور عالی خیال ہو تو یہ تمام معلومات اس کی روح کو بہت زیادہ رنج دیتے ہیں اور اس کی زندگی بلائے جان ہو جاتی ہے۔'' (۱۷)

انہی خدشات کے پیشِ نظر سرسید جدید خطوط پر تعلیمِ نسواں کی مخالفت کرتے رہے اور اپنی وفات سے چند ماہ قبل علی گڑھ میں طبقہ نسواں کے لیے اسکول کھولنے پر رضامند ہوئے۔ (۱۸)

سرسید کی تحریریں ان پر لگائے گئے اِسلام دشمنی پر مبنی الزامات کو غلط ثابت کرتی ہیں۔ سرسید نے ۱۸۳۹ء میں رسولؐ اللہ کے مختصر حالات لکھنے سے لے کر ۱۸۹۸ء میں اُمہات المومنین کے متعلق عیسائی مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھنے تک مسلسل ساٹھ سال تک مذہبی موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ اسبابِ بغاوتِ ہند کی تصنیف کے زمانے ۱۸۵۹ء سے لے کر سر ولیم میور کی Life of Mohamad(1861) کی تردید میں قیامِ لندن کے دوران ۱۸۷۰ء میں خطباتِ احمدیہ لکھنے تک سرسید اِسلام اور پیغمبرِ اِسلام کی مدافعت کے ساتھ انگریز حکام کو ان کی غلطیوں کا احساس بھی دلاتے رہے۔ دراصل تاریخ کے اس دور میں مغرب میں جدید مغربی سائنس کے بہت سے

اکتشافات الہامی متون کے رہے سہے حصوں سے متصادم ہونے لگے۔ سر سید کو یہ صورتِ حال اُس صورتِ حال سے مشابہ لگی جس کا ظہور اِسلام کے ابتدائی ایّام میں یونانی فلسفہ اور سائنس اور قرآنی صداقتوں کے ٹکراؤ کی شکل میں ہوا تھا۔ اسی صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے سر سید نے تبیّن الکلام لکھی، جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ الہامی کتابیں سائنسی صداقتوں سے کبھی متصادم نہیں ہوتیں اور بظاہر نظر آنے والے اختلافات کو ان کتابوں کی مناسب تشریح و تعبیر سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے قولِ متین (۱۸۴۸ء) میں بطلیموسی نظریۂ کائنات کا دفاع فلسفیانہ اور سائنسی بنیادوں پر ہی کیا تھا لیکن جب ایک بار انھوں نے کوپرنیکی انقلاب کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تو اب یہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ الہامی کتب کی روایتی تشریح و تعبیر پر نظر ثانی کریں۔(۱۹)

اسی مقصد کے حصول کے لیے سر سید نے تفسیر قرآن کا ایک نیا اسلوب اختیار کیا اور ہر آیت قرآنی کو عقل و سائنس کے مطابق ثابت کرنا چاہا، تا کہ یورپ کے سائنس دانوں اور فلاسفروں کو تسلی بخش جواب دیا جا سکے۔ جدید خیالات کی اس جدید تفسیر کا سلسلہ ۱۸۷۹ء سے شروع ہوا اور سر سید کی آخری عمر تک جاری رہا مگر مکمل نہ ہو سکا اور صرف ابتدائی ۱۴ پاروں کی تفسیر سورہ نحل تک شائع ہوئی۔(۲۰)

سر سید نے اس جدید طرز کی تفسیر لکھنے اور مرتب کرنے میں جن اصولوں کو ملحوظ رکھا ان کو تحریر فی اصول التفسیر کے نام سے ۱۸۹۲ء میں شائع کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں اصولِ تفسیر کے جو پندرہ نکات شائع کیے گیے تھے وہ درحقیقت ۱۸۷۴ء میں شائع ہونے والے سر سید کے مقالے ''تفسیر السمٰوات'' سے ماخوذ ہیں جن میں انھوں نے مزید ترمیم و اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے زیادہ تر نظریات فخر الدین الرازی اور محی الدین ابن عربی کی قرآن پر کی گئی مشہور کلاسیکی تفسیروں سے ماخوذ ہیں۔ کچھ خیالات تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے معتزلہ سے لیے ہیں اور کچھ ان کی اپنی عقلیت کی پیداوار ہیں۔(۲۱)

سر سید نے اِسلام کو سمجھنے اور احیائے اسلام کے لیے نئے علم الکلام کی ضرورت کو محسوس کیا اور علما کی مخالفت کے باوجود جدید فکر اور علوم کی روشنی میں نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی۔

جہاں سر سید کی بے جا انگریزی مصالحت پر مبنی حکمتِ عملی کے ثبوت ان کے بیانات اور تحریروں سے اکٹھے کیے جا سکتے ہیں وہاں ایک حریت پسند مسلمان کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مقالاتِ سر سید ذیل مذہبی خیالات کو سامنے لاتے ہیں۔ مذہب اِسلام عین حکمت ہے مگر ہندوستان میں جہالت اور ابتری کی وجہ سے مذہب کو ٹھیک روح کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا رہا۔(۲۲)

''مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں وہ اور ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔'' (۲۳)

عقائد شرکیہ ہیں اور صدہا خیال وتوہمات کو عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ (۲۴) بہت سے لوگ دین اسلام سے اس قسم کی دغا بازی کرتے ہیں کہ ہزاروں رسموں کو فضول اور لغو سمجھتے ہیں اور کچھ ہیں ان پر یقین نہیں رکھتے، پر کرتے ہیں۔ (۲۵)

پھر ''تقدیر پر اندھا دھند اعتبار و تکیہ کرنا۔۔۔ جس میں یقین بربادی کا سامان ہے'' (۲۶)

اسی جہالت اور مذہب کی ٹھیک روح سے بے خبر ہونے کا نتیجہ مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی کی صورت میں سامنے آیا۔ (۲۷)

انہی امور کو مدنظر رکھتے ہوئے قوم کی مذہبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نشأۃِ ثانیہ کے حصول کے لئے سرسید نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ جس کے پہلے شمارے میں اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے سرسید نے لکھا کہ اس رسالے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اچھی معاشرت اختیار کریں تا کہ مسلم تہذیب پر غیر مسلموں کی طرف سے کیے گئے اعتراض دور ہوں۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ کچھ مذاہب ترقی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں مگر یہ ہمارا مقصد ہے کہ ہم اسلام کو اس کی صحیح جگہ دیں۔ (۲۸)

معاشرت اور تمدن میں روز بروز تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں مگر ہندوستان میں کٹر مذہبی خیالات رکھنے والے لوگ طرز معاشرت کو بھی مذہبی عبادات کی طرح تبدیل کرنے کے روادار نہیں تھے اور ان ''۔۔۔ کی بدبختی کی جڑ دنیوی مسائل کو دینی مسائل میں جو نا قابلِ تغیر وتبدل ہیں شامل کر لینا ہے۔'' (۲۹)

دوسری طرف عہدِ سرسید میں اصلاح کے جتنے بھی مدعی پیدا ہوئے وہ خود اپنی طرزِ معاشرت میں یہود و ہنود سے بڑھ کر تھے۔ یہ 'نقالوں کا طائفہ' عام مسلمانوں بلکہ متوسط الحال شرفا سے ربط رکھنا بھی معیوب خیال کرتا تھا جب کہ سرسید کی حالت ان سے مختلف تھی۔ مولوی عبدالحق اپنی کتاب سرسید احمد خان۔ حالات و افکار میں لکھتے ہیں:

''سرسید نے تھوڑی بہت تبدیلی جو اپنی طرزِ معاشرت میں کی تھی وہ کسی ذاتی غرض سے نہ تھی بلکہ اس میں سراسر قومی مفاد مدنظر تھا۔۔۔ سرسید کو چارو ناچار فیل بانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور یہ بڑے پھاٹک بغیر نہیں ہو سکتی۔'' (۳۰)

طرز معاشرت کی یہ تبدیلی اور جدید علوم کی تحریک بھی سرسید کی مذہبی فکر پر تنقید کا باعث بنی۔ سرسید کے خیال میں دین اسلام کے احیا کی ضرورت نہیں بلکہ مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کی

تہذیب وشائستگی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے برملا کہا: ''اِسلام ایک لازوال نور ہے جو ہمیشہ روشن ہے اور ہمیشہ روشن رہے گا۔'' (۳۱)

''ہاں اگر تمہاری مراد اِسلام سے اہل اِسلام ہیں تو بلاشبہ ان کی گذشتہ اور موجود اور آئندہ حالت نہایت دل خراش ہے۔'' (۳۲)

ڈاکٹر سی۔ ڈبلیو۔ ٹرول (Christian W. Troll) نے اپنے مضمون ''سرسید احمد خان اور انیسویں صدی میں علم الکلام کا احیا'' میں سرسید کو نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے قائد کی شکل میں دیکھا ہے بلکہ انھیں ایک اِسلامی مفکر بھی تسلیم کیا ہے۔ (۳۳)

مغربی مستشرقین کے اس رائے کے برعکس اہلِ اسلام سرسید کے علم الکلام سے نالاں رہے۔ یہاں تک کہ سرسید کے نہایت قریبی دوست اور رفقائے کار بھی ان کی مذہبی فکر کو راست نہ جانتے تھے۔ دینِ اِسلام کے خلاف یورپیوں کی فلسفیانہ موشگافیوں کے جواب اور مسلم فکر کے جمود کو ختم کرنے کے لیے سرسید احمد خان نے ایک نئے علم الکلام کی ضرورت کو محسوس کیا، ایک ایسا جدید علم الکلام جو جدید سائنس کی تطبیق کر سکے، اس طرح اِسلام کا اصل روشن چہرہ بے نقاب ہو اور مسلمانوں میں جدید سائنسی علوم کی ترویج ممکن ہو۔ علامہ اقبال اپنے کتابچے اِسلام اور احمدیت (۱۹۳۶ء) میں سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے نہ صرف اِسلام کے جدید تعین کی سمت کو محسوس کیا بلکہ اس موضوع پر کام بھی کیا۔ ہم اختلاف تو کر سکتے ہیں مگر انکار نہیں کہ ان کی بے چین رُوح نے سب سے پہلے عہدِ جدید کے اثرات کو قبول کیا۔ (۳۴)

مذہبی حمیت سرسید میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کے بعض خیالات سے اختلاف سہی مگر ان کی اِسلام اور پیغمبرِ اسلام سے محبت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ سر ولیم میور کی کتاب (Life of Mohammad) دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو رویا۔ ڈاکٹر ہنٹر (W.W. Hunter) کی کتاب پر ریویو لکھتے ہوئے سرسید نے مولوی کرامت علی جون پوری کے ہندوستان کو دارالسلام قرار دینے کے فتوے سے اختلاف کرتے ہوئے وہی رائے دی جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے چالیس سال بعد جزیرہ مالٹا میں دی تھی۔ یعنی نوآبادیاتی ہندوستان کے عصری حالات ایسے ہیں کہ اسے ایک اعتبار سے دارالسّلام اور ایک اعتبار سے دارالحرب قرار دیا جا سکتا ہے۔ (۳۵)

مسلمانانِ ہند کی ترقی کے لیے سرسید احمد خاں نے اینگلو مسلم کلچر کا آغاز کیا۔ سرسید کی انگریز مصالحت آمیز حکمتِ عملی کے پسِ پردہ بھی مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کی خواہش ہی کارفرما تھی۔ سرسید کا خیال تھا کہ ''تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہیں وہ خدا تعالیٰ نے یورپ اور بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔'' (۳۶)

اسی نظریے کے پیشِ نظر وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے جدید علم کا حصول ضروری خیال کرتے تھے اور یہ کام سیاسی امن و استحکام کا متقاضی تھا۔ صاحبِ موج، شیخ محمد اکرام کے مطابق سرسید نے جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ سے زیادہ قابل اور ٹھوس اسلامی خدمات انجام دی ہیں۔(۳۷) اس رائے سے پورا اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی تاریخ میں سرسید سے تیز دل و دماغ والا عملی رہنما پیدا نہیں ہوا۔ ٹرول اپنے مذکورہ مضمون میں، آر کیسپر (R.Casper) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں محمد عبدہ کا علم الکلام ایک نیا اعتزال ہے جب کہ سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات معتزلہ کی تجدید کرنے کے باوجود نوفلسفیانہ ہیں۔(۳۸)

مصر میں عبدہ کو صرف ایک دشمن فرنگی کا سامنا رہا جب کہ سرسید کے دو دشمن، فرنگی اور ہنود تھے۔ ان دونوں کے اتحاد کو کم زور کرنا سرسید کا کارنامہ ہے۔ سرسید کا مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت سے روکنا بھی اسی نصب العین کا تقاضا تھا۔

سرسید نے شاعری بھی کی اور وہ 'آہی' تخلص کرتے تھے۔(۳۹)

اُنھوں نے اپنے ایک مقالے ''راہِ سنّت و ردِّ بدعت'' کے آغاز میں ایک نظم 'مناجات' شامل کی ہے جس میں سرسید خدا سے ایمان و عقائد کی پختگی کے لیے دعا گو ہیں۔ مولانا اسماعیل پانی پتی کے خیال میں خالص مذہبی اور اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی یہ نظم، سرسید کے ذاتی خیالات اور عقائد کو کامیابی سے ظاہر کرتی ہے۔ ان کے خیال میں جو لوگ سرسید کو کافر اور ملحد بتاتے ہیں وہ اس نظم پر غور کریں کہ ایک ملحد انسان خدا کے حضور کسی طرح بھی ایسی عاجزانہ التجا نہیں کر سکتا۔(۴۰)

الٰہی شاہ تو ہے میں گدا ہوں الٰہی تو غنی میں بے نوا ہوں
الٰہی تو کریم اور میں گرفتار الٰہی تو غفور اور میں گنہ گار
خداوندا کہاں تو اور کہاں میں الٰہی تو قوی اور ناتواں میں
تو اب وہ کر جو ہے تجھ کو سزاوار کیا میں نے تھا جو مجھ کو سزاوار
چھڑا دے دین اور دنیا کے غم سے الٰہی بخش دے اپنے کرم سے
تو کر دے خاتمہ با خیر میرا الٰہی آسرا رکھتا ہوں تیرا
پھر اس کے وصل کی مجھ کو دوا دے الٰہی دردِ عشقِ مصطفٰی دے
لگا دے گھاٹ سے میرا سفینہ الٰہی مجھ کو کر خاکِ مدینہ
الٰہی فیغنی من کسل فین بجاہ المصطفٰی مولٰی الجمیع
وھب لی فی مدینۃ قرارا بایمان و دفن بالبقیع (۴۱)

البتہ سرسید کے مذہبی خیالات بعض ایسے پہلو لیے ہوئے تھے جو مخالفت کا باعث بنے۔ ان کے رفقا میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے ان کے بعض نظریات سے اختلاف نہ رہا ہو۔ سرسید کے ان خیالات کے باوجود بہت سے

علم دوست اور ترقی پسند اشخاص ان کے گرد شامل ہو گئے اور تحریک علی گڑھ کی صورت پیدا ہو گئی۔ تحریکِ علی گڑھ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ادب کو وسیلہ اظہار بنایا۔ جدید اُردو ادبیات کے آغاز کا سہرا اسی تحریک کے سر ہے۔ اس کے زیرِ اثر نثر میں مقفیٰ و مسجع عبارت کی جگہ سلیس رواں اور سادہ نثر کو رواج دیا گیا۔ شاعری میں وہ طرزِ ادا در آئی جو اُمتِ مسلمہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے اظہار کے لیے خاص تھی۔ گویا 'ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک کے سارے پھل میٹھے تھے۔' سرسید کی مساعی سے مغربی تعلیم اور ادب کے زیرِ اثر مسلمانانِ ہند میں ایک ایسی جماعت کا ظہور ہوا جو اجتماعت، عقلیت اور افادیت کے فلسفے سے خوب واقف تھی اور ان مغربی ہتھیاروں سے لیس ہو کر مغرب کی بے روح اور مادہ پرست تہذیب کے مقابل مسلم معاشرے کی بقا کی تدبیر کر سکتی تھی۔

حوالہ جات:

۱۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، طبع بیستم ۱۹۹۷ء) ص ۷۸، ۷۹

۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، (لاہور: نیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء) ص ۳۰۳

۳۔ ایضاً، ص ۴۵۲

۴۔ ایضاً، ص ۶۹

۵۔ پی۔ سی۔ جوشی، (مرتب): انقلابِ اٹھارہ سوستاون، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان) طبع سوم ۱۹۹۸ء، ص ۲۴۷

۶۔ خواجہ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۳۲۹

۷۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، (لکھنؤ: مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام) طبع دوم ۱۹۷۰ء، ص ۱۲

۸۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تفہیم و تجزیہ، (لاہور: کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ جامعہ پنجاب) ۱۹۹۹ء، ص ۱۷

۹۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سرسید احمد خان اور جدت پسندی، (کراچی: ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۲ء) ص ۲۸

۱۰۔ سرسید احمد خان، مسافرانِ لندن، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۷

۱۱۔ سرسید احمد خان، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز (مرتبہ: امام دین گجراتی)، (لاہور: ملک فضل دین، س۔ن) ص ۱۲۲

۱۲۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ پنجم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۲ء) ص ۳۲

۱۳۔ ایضاً، حصہ یازدہم، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۱۵۔ سرسید احمد خان، مکتوباتِ سرسید، (مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۸۵ء) ج ۲، ص ۱۸۳

۱۶۔ سرسید احمد خان، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز، ص ۲۵

۱۷۔ سرسید احمد خان، مکتوباتِ سرسید، ج ۲، ص ۱۸۳

۱۸۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سرسید احمد خان اور جدت پسندی، ص ۱۵

۱۹۔ محمد اکرام چغتائی (مرتب)، مطالعہ سرسید، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ص ۱۹۵، ۱۹۶

۲۰۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ دوم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۷

21. Qammaruddin Khan , Conflict of Reason and Tradition in Islam, Islamabad: Book Trust, 1994, p:216

۲۲۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ پنجم، ص ۸۵، ۸۶

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۰۹

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ دوازدہم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۳ء) ص ۱۰۴

۲۶۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ پنجم، ص ۱۶۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۴، ۸۵

28. Sharif, M. M. , A History of Muslim Philosophy(Vol.2), Karachi: Royal Book Company, 1983, p:1598

۲۹۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ پنجم، ص ۵

۳۰۔ عبدالحق، مولوی، سرسید احمد خان ۔ حالات و افکار، (کراچی: انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان، ۱۹۵۹ء) ص ۳۶

۳۱۔ سرسید احمد خان: مقالاتِ سرسید حصہ ہشتم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۲ء) ص ۱۴۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۳۳۔ محمد اکرام چغتائی (مرتب)، مطالعہ سرسید، ص ۱۸۱ تا ۲۰۲

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۳۵۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۸۳، ۸۴

۳۶۔ سرسید احمد خان، مسافرانِ لندن، ص ۱۸۵

۳۷۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۱۳۷، ۱۳۸

۳۸۔ محمد اکرام چغتائی (مرتب)، مطالعہ سرسید، ص ۲۰۲

۳۹۔ لالہ سری رام، خم خانۂ جاوید (تذکرہ ہزار داستان)، (لاہور: مطبع نول کشور، ۱۹۰۸ء) ص ۱۱۷

۴۰۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید حصہ پنجم، ص ۳۵۶

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۵۷، ۳۵۸

مآخذ

۱۔ ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، لکھنؤ: مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام، طبع دوم ۱۹۷۰ء۔

۲۔ جوشی، پی۔سی (مرتب)، انقلابِ اٹھارہ سو ستاون، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، طبع سوم ۱۹۹۸ء۔

۳۔ حالی، خواجہ الطاف حسین، حیاتِ جاوید، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء۔

۴۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، تفہیم و تجزیہ، لاہور: کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ جامعہ پنجاب، ۱۹۹۹ء۔

۵۔ سرسید احمد خان، مسافرانِ لندن، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۱ء۔

۶۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سر سید حصہ پنجم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۲ء۔

۷۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سر سید حصہ دوازدہم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۳ء۔

۸۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سر سید حصہ دوم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۱ء۔

۹۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سر سید حصہ ہشتم (مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۲ء۔

۱۰۔ سرسید احمد خان، مکتوباتِ سرسید، (مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلس ترقیِ ادب،

۱۹۸۵ء۔

۱۱۔ سرسیداحمد خان، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز (مرتبہ:امام دین گجراتی)، لاہور: ملک فضل دین، س۔ن۔

۱۲۔ عبدالحق، مولوی، سر سید احمد خان ۔حالات و افکار ،کراچی: انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان، ۱۹۵۹ء۔

۱۳۔ لالہ سری رام، خم خانۂ جاوید (تذکرہ ہزار داستان)، لاہور: مطبع نول کشور، ۱۹۰۸ء۔

۱۴۔ محمد اکرام چغتائی (مرتب)، مطالعہ سر سید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔

۱۵۔ محمد اکرام، شیخ، موجِ کوثر، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، طبع بیستم ۱۹۹۷ء۔

۱۶۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور جدت پسندی ،کراچی: ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۲ء۔

۱۷۔ Qammaruddin Khan , Conflict of Reason and Tradition in Islam, Islamabad: Book Trust, 1994.

۱۸۔ Sharif, M. M. , A History of Muslim Philosophy(Vol.2), Karachi: Royal Book Company, 1983.